رسائل و مسائل

سود، پردہ، طلاق اور مہر

"اشاعت گذشتہ میں، ڈاکٹر سیادت علی صاحب (استاذ قانون، کلیہ جامعہ عثمانیہ) کے خطبۂ صدارت کے متعلق ایک مفصل استفسار، جناب مولوی ابوالخیر محمد خیراللہ صاحب کی جانب سے شائع ہو چکا ہے، جس میں مسائل بحث طلب (سود، پردہ، طلاق اور مہر) کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی اصل عبارتیں بھی نقل کر دی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمارے پاس چند اور استفسارات بھی آئے ہیں، مگر ان کے شائع کرنا موجب تطویل ہوگا۔ آیندہ صفحات میں ہم ان مسائل کے متعلق ایک جامع اور مفصل بحث کریں گے، جس میں امید ہے کہ تمام حضرات مستفسرین کے پیش کردہ سوالات کا جواب آجائے گا۔"

یہ امر ایک گونہ موجب اطمینان ہے کہ ہماری جدید تعلیمیافتہ جماعت میں زندگی کے مسائل کو تہذیب مغربی کے اصول و نظریات کے بجائے اصول اسلام کے مطابق حل کرنے کا میلان پایا جاتا ہے، اور اسی لیے وہ ہر اس مسئلہ میں جو ان کے نزدیک اہمیت رکھتا ہے، اسلام کی طرف رجوع کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ دیکھ کر افسوس بھی ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مطالعہ، تحقیق، اور غور و فکر کی جو کم سے کم حد ہونی ضروری ہے، اور جس کو وہ خود اپنی علمی تحقیقات میں ملحوظ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، اس کو اسلامی مسائل پر بحث کرنے میں ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ اجتہاد کی کوشش کی جاتی ہے جو بجائے خود کوئی نامحمود شے نہیں ہے، نہ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو اس کو شجر ممنوع سمجھتے ہیں، لیکن اس کے لیے جو ضروری اور ناگزیر شرائط

ہیں ان میں سے کسی کا بھی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اصول اسلامی کو جدید حالات و ضروریات پر منطبق کرنے اور اس طریقے کے زندگی کے جدید مسائل کو حل کرنے کے لیے اب تک جتنے اقدامات اس گروہ کی طرف سے کیے گئے ہیں ان میں سے کسی میں بھی اتنی صلاحیت استواری اور قوت موثرہ نہ پائی گئی کہ تہذیب اسلامی کا مزاج اس کو قبول کرتا اور امت مسلمہ کی زندگی میں اس سے کوئی مفید انقلاب رونما ہوتا۔ بلکہ اس قسم کے غیر محققانہ اجتہادات نے، جن کی بنیاد ناکافی مطالعہ اور ناکافی غور و فکر پر قائم ہوتی ہے، ملت کے مزاج پر وہی اثر کیا ہے جو کسی کمزور مریض کو کچی یا ادھ کچری غذا دینے سے ہوتا ہے۔ ضعف اور اضمحلال تو دور نہ ہوا کیونکہ وہ غذا ملی ہی نہیں جو خون صالح بناتی، اور جسم میں زندگی کی تازہ روح پھونکتی، البتہ پہلی شکایات پر سوء ہضم، بحران اور اختلال دماغی کا اور اضافہ ہو گیا!

اس تنقید سے ہمارا مقصد کسی کی تنقیص نہیں، بلکہ ہم اپنی قوم کے جدید تعلیم یافتہ گروہ کو اس کی اصلی کمزوری سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اس کی اصلاح کی کوشش کرے۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانوں پر ایک مدت سے جو ضعف و اضمحلال اور جمود و خمود طاری ہے وہ اس وقت تک دور نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان میں جہاد و اجتہاد کی وہ روح بیدار نہ ہو جائے جو ان کی تہذیب کو پھر سے ایک متحرک اور نامی تہذیب بنا دے۔ لیکن جب ہم ان لوگوں پر نظر ڈالتے ہیں جن سے اس باب میں کوئی امید وابستہ کی جا سکتی ہے، تو ساری امیدیں مایوسی سے بدل جاتی ہیں۔ ایک طرف علماء ہیں جن کے پاس دین کا علم، علوم اسلامی کے مآخذ اصلیہ تک دست رس ہے، مجتہدین سلف کے آثار و نقوش سے استفادہ کرنے کے وسائل ہیں، تحقیق کی استعداد ہے، غور و فکر کے مواقع ہیں مگر اجتہاد کی روح نہیں، تحقیق کا شوق نہیں، حتیٰ کہ اگلوں کے بنائے ہوئے راستوں سے ایک قدم آگے بڑھنے کی بھی ہمت نہیں۔ دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ حضرات ہیں جن میں تحقیق کا شوق ہے، اجتہاد کی روح ہے، جدید ضروریات کے لحاظ سے پیش قدمی کرنے اور نئے راستے نکالنے کی خواہش اور جرأت ہے مگر اسلام کا علم نہیں، تحقیق کے وسائل تک دست رس نہیں،

اسلامی ذہنیت اور اسلامی طریق فکر و نظر سے بہرہ نہیں، اور کم سے کم اتنی علمی واقفیت بھی نہیں جس سے وہ یہ سمجھ سکیں کہ اسلام کے حدود میں تحقیق و اجتہاد کی گنجائش کہاں تک ہے اور کہاں پہنچ کر پیش قدمی حدِ اسلامی سے متجاوز ہو جاتی ہے۔ ان دونوں گروہوں سے مایوس ہونے کے بعد اگر کوئی امید وابستہ کی جا سکتی ہے تو اس نہایت قلیل التعداد گروہ سے جو علوم قدیمہ و جدیدہ کا جامع ہے۔ لیکن اس گروہ کا جو نمونہ ڈاکٹر سیادت علی صاحب نے پیش کیا ہے اس کو تو کسی حیثیت سے بھی امید افزا نہیں کہا جا سکتا۔ وہ محض ڈاکٹر ہی نہیں، ماشاء اللہ مولوی فاضل بھی ہیں۔ یورپ کی ایک بہترین یونیورسٹی میں تحقیق و اجتہاد کی باقاعدہ تربیت پا چکے ہیں، ہندوستان کی ایک بہترین یونیورسٹی میں قانون جیسے اہم مضمون کے پروفیسر ہیں، ان کے پاس تحقیق کے ذرائع بھی ہیں، مواقع بھی، اور اعلیٰ تربیت یافتہ صلاحیت بھی، مگر اپنے خطبہ میں چند مسائل پر انھوں نے اسلامی نقطۂ نظر سے جو بحث کی ہے اس کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان مسائل کو نہ انہوں نے سمجھا نہ ان پر غور کیا، نہ ان کے متعلق کم سے کم ضروری معلومات بہم پہنچائیں، اور اس کے باوجود ان مجتہدانہ انداز میں کلام فرمایا، اور یہ تک محسوس نہ کیا کہ کہاں کہاں ان کا اجتہاد اصول سے متجاوز ہو کر ابتداع بن گیا ہے۔

سود کے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز ہی وہ اس طرح فرماتے ہیں کہ قرآن کے حکم تحریم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بشدت منع فرمانے کے باوجود مسلمانوں میں "دورِ اول ہی سے اس کی شروعات کا پتہ چلتا ہے" اور یہ کہ اس زمانہ میں "ایک نہ ایک شکل میں سود کا لین دین ہوتا تھا" اور وہ دور گذر جانے کے بعد "تو مسلمانوں میں سود کا رواج عام ہو گیا"۔ اس کا ثبوت کیا ہے؟ یہ کہ "امام مالک کی مدونہ میں سود پر سینکڑوں مسائل کا ذکر ہے"۔ "حضرت ابن عباس بصرہ سے مکہ تک سفاتج پر کچھ زائد لینے کو جائز سمجھتے تھے"، "امام ابو یوسف حیل شرعی کے ذریعہ سے سود لینے کو پسند فرماتے تھے"۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے "دارالامان و دارالاسلام کے مسئلہ کی بنا پر جواز سود کا فتویٰ دیا ہے" اور ان سب سے بڑھ کر

یہ کہ "سود کی وسعت اور اس کے حدود کے متعلق خود حضرت عمرؓ کو شبہ رہا ہے" اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں صرف اس سود کو حرام قرار دیا گیا ہے جو "اضعافاً مضاعفاً" (؟ مضاعفۃ) یعنی سود در سود ہو گا، ور مشہور و مستند حدیث الذَّهَبَ بالذَّهَبِ والفضة بالفضة کا منشا در اصل مبادلہ کو ختم کرنا اور بیع کو رواج دینا اور عربستان میں ایک واحد سکہ کی ترویج تھا۔ یہ تمام باتیں صاف ظاہر کرتی ہیں کہ فاضل پروفیسر نے اس مسئلہ کے متعلق کافی مطالعہ کر کے اتنا مواد بھی فراہم نہیں کیا جو اس پر کلام کرنے کے لیے کم از کم ضروری تھا۔

اگر وہ "امام مالک کی مدونہ" کو دیکھتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ اس میں سود کے متعلق جتنے مسائل بیان کئے گئے ہیں سب کے سب سود کے تمام ممکن ابواب کو بند کرنے کے لیے ہیں نہ کہ ان کو کھولنے کے لیے، البتہ بعض جزئیات میں بظاہر سود کا جو شبہ ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہ حنفی اور فقہ مالکی میں تھوڑا سا اختلاف ہے، حنفیہ نے حدیث الذهب بالذهب الخ میں علت حکم قدر و جنس کو قرار دیا ہے، اور مالکیہ نے اقتیات و ادخار کو۔ اس بنا پر بعض صورتیں ایسی نکل آتی ہیں جو حنفیہ کے نزدیک سود کی حد میں آجاتی ہیں مگر مالکیہ کے مذہب میں وہ سود نہیں ہیں۔

سفاتج کے متعلق ابن عباسؓ سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ اگر قرض میں سفتج لکھنا مشروط ہو تو حرام ہے" اور اگر مشروط نہ ہو بلکہ قرض لینے والا بطور خود سفتج لکھ دے تو اس میں کچھ مضایقہ نہیں۔ ابن ابی شیبہ نے تمام صحابہ اور ائمہ سلف کے متعلق لکھا ہے کہ کانوا یکرھون کل قرض جر منفعتہ۔ اسی باب میں سفاتج بھی آجاتے ہیں۔

امام ابو یوسف پر اس سے بڑھ کر کوئی تہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ حیل شرعی سے سود لینے کو پسند فرماتے تھے۔ بلا شبہ انہوں نے حیل میں ایک کتاب لکھی ہے، جو بالکل فنی چیز ہے، لیکن امام صاحب اور تمام بزرگان حنفیہ نے تصریح فرمایا ہے کہ شرعی حیلوں کا استعمال حرام سے بچنے اور گناہ سے دور ہونے

کے لیے کرنا چاہیے نہ کہ تکالیف شرعیہ سے بچنے اور ابطال حق و اثبات باطل کے لیے۔ اس تصریح کے بعد اگر کوئی کہے کہ سود فلاں فلاں حیلوں سے کھایا جا سکتا ہے، یا زکوٰۃ سے بچنے کی فلاں فلاں صورتیں ممکن ہیں، تو اس کے معنی یہ نہیں کہ کہنے والا ایسا کرنے کو "پسند" کرتا ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ قائل کی رائے میں اگر کوئی ایسا کرے تو قانون کی گرفت سے بچ سکتا ہے، یا بالفاظ دیگر خواہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے ساتھ کچھ ہی معاملہ پیش آئے مگر دنیا میں اس کو سود خواری کا الزام دینے یا اس سے زکوٰۃ کا مطالبہ کرنے کے لیے کوئی قانونی گنجائش نہیں ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کے متعلق یہ انکشاف بالکل جدید ہے کہ انہوں نے دارالحرب میں "جواز سود" کا فتویٰ دیا تھا۔ کسی چیز کو سود قرار دینے کے بعد اسے "جائز" کہنے کی جرأت شاہ صاحب تو درکنار، اگر کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی کرتی تو تمام امت بالاتفاق اس کو کافر قرار دیتی کیونکہ یہ تو قرآن کا انکار ہے۔ مسئلہ جس کو اس قدر غیر قانونی الفاظ میں ڈاکٹر صاحب نے بیان کیا ہے دراصل ان الفاظ کے ساتھ کتب فقہیہ میں آیا ہے کہ مسلم اور کافر کے درمیان دارالحرب میں جو معاملہ ہو اس پر سود کا اطلاق نہیں ہوتا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب سے بہت پہلے امام ابوحنیفہ اور امام محمدؒ یہ فتویٰ دے چکے ہیں، اور ان کی اپنی ذاتی رائے نہیں ہے بلکہ حدیث لا ربا بین المسلم و الحربی فی دارالحرب اس کا ماخذ ہے۔ امام ابویوسف، شافعی، مالک اور احمد رحمہم اللہ کے نزدیک یہ حدیث ثابت نہیں، لیکن امام اعظم اور ان کے جلیل القدر شاگرد کے نزدیک یہ حدیث قابل اعتماد ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ شاید نہ کہا جاتا اگر آپ کے اصل الفاظ پیش نظر ہوتے۔ آپ نے سود کے متعلق دراصل یہ فرمایا تھا کہ۔

اِنَّ آیۃ الربا من آخر ما نزل من القرآن	آیت ربا قرآن مجید کی آخری نازل شدہ آیت
وانّ النبی صلعم قبض قبل ان یبیّنہ	میں سے ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم قبل اس کے کہ

لَنَا فدعوا الربا و الریبة۔ اس کے احکام پوری طرح واضح فرماتے، وفات پاگئے اس لیے تم سود بھی چھوڑو اور جس چیز میں سود کا شبہ ہو۔ اسے بھی چھوڑ دو۔

اس قول سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک چونکہ بعض ابواب میں شبہ تھا کہ وہ ربا کی حد میں آتے ہیں یا نہیں، اس لیے آپ تاکید فرماتے تھے کہ جس چیز میں ربا کا شبہ بھی ہو اس کو چھوڑ دو تاکہ کہیں نادانستہ تم حرام میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اس قول سے یہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں کہ ربا کی وسعت اور اس کے حدود چونکہ حضرت عمرؓ جیسے ماہر احکام شریعت تک کے نزدیک مشتبہ تھے اس لیے بجز ربا کی اس خاص شکل کے جس کو خاص طور پر قرآن مجید میں حرام فرمایا گیا ہے، باقی تمام اقسام کے سود هَنِيئًا مَّرِيئًا کھاؤ اور اپنے ضمیر پر سے اس کی ممانعت کے بار گران کو بھی اٹھا دو تاکہ اندر سے کبھی دل بھی ملامت نہ کرے!

یہ ارشاد کہ قرآن میں صرف سود در سود کی ممانعت کا حکم ہے، اگر دانستہ تحریف نہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قائل نے قرآن مجید کو پڑھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ قرآن مجید میں ایک جگہ مطلقاً ربا سے باز رہنے کا حکم دیا گیا ہے (البقرہ۔ رکوع ۳۸) اور دوسری جگہ خاص طور پر سود در سود کھانے کو منع کیا ہے (آل عمران رکوع ۱۴) ان میں سے ایک کو چھوڑ کر دوسری آیت سے استدلال کرنا۔ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ کا مصداق ہے قرآن مجید کا انداز بیان یہ ہے کہ کبھی کبھی وہ ایک بری چیز کو منع کرنے کے لیے اس کی کسی خاص بدترین صنف کو لے کر اس سے منع کرتا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ صرف وہی خاص صنف حرام ہے اور باقی سب حلال ہیں۔ مثلاً قتل اولاد سے جہاں منع کیا گیا ہے وہاں ارشاد ہوتا ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ "اپنے بچوں کو مفلسی کے خوف سے مت قتل کرو"۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی اور غرض کے لیے بچوں کو قتل کرنا ممنوع نہیں ہے۔ ایسی اور بہت سی مثالیں قرآن میں موجود ہیں۔ اس قسم کی آیات میں جو شخص معنی کو نظر انداز کر کے سراسر لفظ پر نگاہ رکھے گا وہ خدا جانے کن کن مکروہات و منہیات میں مبتلا ہو جائے گا۔ پھر اگر

ایسی ہی لفظ کی پابندی کرنی ہے تو یہ کیوں نہ کہا جائے کہ سود در سود بھی صرف "کھانا" ممنوع ہے، باقی رہا کپڑے بنانا مکان تعمیر کرنا اور موٹر خریدنا وغیرہ تو ان اغراض کے لیے سود در سود لینا ہرگز ممنوع نہیں، کیونکہ قرآن میں لَا تَأْكُلُوْا (نہ کھاؤ) کہا گیا ہے لَا تَأْخُذُوا (نہ لو) نہیں کہا گیا۔

الذهب بالذهب والفضة بالفضة الخ سے شارع کا جو منشا ڈاکٹر صاحب نے سمجھا ہے، اس کی غلطی محض پوری حدیث کے الفاظ پڑھ لینے ہی سے واضح ہو سکتی ہے۔

الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثلٍ سواءً بسواءٍ يدًا بيدٍ فاذا اختلفت هٰذه الاجناس فبيعوا كيف شئتم اذا كان يدًا بيدٍ

سونے کا مبادلہ سونے سے، چاندی کا مبادلہ چاندی سے، گیہوں کا گیہوں سے، جو کا جو سے، کھجور کا کھجور سے، نمک کا نمک سے صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مثل اور ایک دوسرے کے مساوی ہوں اور دست بدست لین دین ہو جائے۔ البتہ اگر ان اجناس میں اختلاف ہو تو تم جس طرح چاہو بیچ سکتے ہو بشرطیکہ لین دین دست بدست ہو۔

اس حدیث سے شارع کا یہ منشا سمجھنا کہ "مبادلہ" موقوف کیا جائے اور زرلستان میں ایک واحد سکہ کی ترویج ہو، صرف اسی شخص کا کام ہو سکتا ہے جس نے کہیں صرف "الذهب بالذهب والفضة بالفضة ..." کے الفاظ پڑھ لیے ہوں اور کتب حدیث میں پوری روایت نکال کر دیکھنے کی زحمت نہ اٹھائی ہو، ورنہ یہ تو قطعاً بعید از قیاس ہے کہ کوئی عربی دان شخص اس پوری حدیث کو پڑھے (جس میں بالفاظ صریح مبادلہ کی شرائط بیان کی گئی ہیں) اور اس کا مفہوم یہ سمجھے کہ اس سے مبادلہ موقوف کر کے بیع بواسطۂ زر مسکوک کو رواج دینا مقصود ہے۔

اسی قسم کی شانِ تحقیق کا اظہار پردہ کے مسئلہ میں بھی کیا گیا ہے، مثلاً دعویٰ یہ ہے کہ عہد نبوی میں

پردہ کا رواج نہ تھا۔ اس کے ثبوت میں یہ واقعہ پیش کیا جاتا ہے کہ ہجرت کے موقع پر انصار کی لڑکیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کیا تھا۔ حالانکہ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ لڑکیاں جوان جوان تھیں اور آج کل کی ساڑیوں اور بلاؤز جیسے لباس پہن کر گھروں سے نکل پڑی تھیں تب بھی اس واقعہ سے اس مسئلہ میں کوئی استدلال نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ واقعہ عین ہجرت کے موقع کا ہے اور پردہ کے احکام ہجرت کے بہت بعد نازل ہوئے ہیں۔

دوسرا ثبوت یہ پیش کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتیں بے پردہ آکر بیعت کرتی تھیں لیکن احادیث میں کہیں بھی یہ تصریح نہیں کہ عورتیں بے پردہ آتی تھیں، البتہ بخاری، مسلم اور نسائی میں یہ حدیث موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے محض بذریعہ کلام دور ہی سے بیعت لیتے تھے اور بیعت کی غرض سے بھی ان کے ہاتھ کو مس کرنا پسند نہ فرماتے تھے۔ بلاشبہ احادیث میں یہ ارشاد نبوی ضرور آیا ہے کہ کم من کاسیۃ فی الدنیا عاریۃ یوم القیمۃ (بہت سی ایسی عورتیں ہیں جو دنیا میں لباس پہنے ہوئے ہیں مگر قیامت کے روز برہنہ ہونگی) اور ایک دوسرا فرمان نبوی ہے کہ نساء کاسیات عاریات مائلات ممیلات لا یدخلن الجنۃ ولا یجدن ریحھا (بہت سی عورتیں جو لباس پہننے پر بھی ننگی رہتی ہیں اور مردوں کی طرف مائل ہوتی اور ان کو اپنی طرف مائل کرتی ہیں وہ جنت میں داخل نہ ہوں گی اور اس کی ہوا تک ان کو نصیب نہ ہوگی) لیکن ان احادیث سے یہ نتیجہ کیونکر نکالا جا سکتا ہے کہ عورتیں حضور کی مجلس میں ایسے لباس پہن کر آنے کی جرأت کیا کرتی تھیں جن کے اندر سے ان کے جسم جھلکتے ہوتے تھے۔ اس قسم کا ایک ہی واقعہ شاذ حضور کی مجلس میں پیش آیا ہے جس پر حضور نے ایسی سخت تنبیہ فرمائی تھی کہ کسی کو پھر اس طرح آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس واقعہ کو ماضی استمراری کے صیغہ میں بیان کرنے کے تو یہ معنی ہیں کہ ایسا ہوتا رہتا تھا، حالانکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔

اس سے زیادہ بے ثبوت بلکہ خلاف واقعہ یہ بات ہے کہ عہد نبوی میں عورت اور مرد ایک ہی صف میں نماز پڑھتے تھے۔ بخاری میں حضرت انس سے یہ روایت آئی ہے کہ ان کے مکان میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے کھڑے ہوئے، مقتدی صرف تین تھے یعنی حضرت انس، ایک یتیم لڑکا اور حضرت انس کی والدہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کو بیٹے کے پہلو میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی اجازت نہ دی اور وہ پیچھے تنہا کھڑی ہوئیں۔ بخاری ہی میں حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے کے بعد کچھ دیر ٹھیر جاتے یہاں تک کہ پیچھے کی صفوں سے تمام عورتیں اٹھ کر چلی جاتیں۔ پھر آپ اور دوسرے مرد باہر نکلتے۔ مردوں اور عورتوں کا ایک صف میں خلط ملط ہو کر نماز پڑھنا تو درکنار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تو عورتوں کا مسجد میں آنا بھی پسند نہ تھا۔ چنانچہ ابوداؤد میں حضرت ابن عمر سے یہ روایت منقول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا تمنعوا نساءکم المساجد وبیوتھن خیر لھن۔ (اپنی عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے نہ روکو اگرچہ ان کا گھروں میں نماز پڑھنا زیادہ بہتر ہے) پھر ان کو مسجد میں آنے کی اجازت بھی عام نہ تھی بلکہ صرف رات کے لیے بھی بخاری میں حضرت ابن عمر سے مروی ہے حضور نے فرمایا۔ اذا استأذنکم نساءکم باللیل الی المسجد فاذنوا لھن (بخاری، باب خروج النساء الی المساجد باللیل والغلس) حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے صبح بہت سویرے اپنی چادروں میں ڈھکی چھپی جاتی تھیں اور واپسی کے وقت اتنا اندھیرا ہوتا تھا کہ کوئی ان کو پہچان نہ سکتا تھا۔ اس پر مزید حکم یہ تھا کہ مسجد میں خوشبو لگا کر نہ جائیں۔ موطا میں امام مالک نے حضور کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ اذا شھدت احداکن صلوۃ العشاء فلا تمسن طیبا (جب تم میں سے کوئی عورت عشا کی نماز میں شریک ہو تو خوشبو نہ لگائے) تعجب ہے کہ ان میں سے کوئی حدیث بھی پروفیسر سیادت علی صاحب کو نہ ملی اور نہ معلوم کہاں سے یہ غیر معروف اطلاع مل گئی کہ حضرت عمر کے عہد تک مسلمان عورتیں مسجدوں میں مردوں کے ساتھ ایک ہی صف میں پہلو بہ پہلو کھڑی ہو کر نماز پڑھا کرتی تھیں۔

آخری ثبوت جو عہد رسالت میں پردہ کا رواج نہ ہونے کے باب میں پروفیسر صاحب نے پیش فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ مراسم حج میں آج تک بھی یہ "ضروری" ہے کہ میدان عرفات میں عورتیں "بے نقاب" کھڑی رہیں۔ یہ مسئلہ ہم کو حدیث یا فقہ کی کسی کتاب میں نہیں ملا، اور نہ کسی حاجی نے اس کی تصدیق کی حیدرآباد میں مطوفین کثرت آتے رہتے ہیں اور مناسک حج کے جزئیات پر ان سے زیادہ کسی کو عبور نہیں ہوتا۔ پروفیسر سیادت علی صاحب کو اگر کتابوں سے مراجعت کرنے کا موقع نہ ملا تھا تو اس بات کو پبلک میں بیان کرنے سے پہلے کم از کم کسی مطوف ہی سے دریافت کر لینا چاہیے تھا۔

سود اور پردہ کے باب میں جس انداز تحقیق سے کام لیا گیا ہے وہ آپ نے دیکھ لیا۔ اب طلاق کے مسئلہ کو بھی ملاحظہ کیجئے پروفیسر سیادت علی صاحب نے تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ اس راز کا انکشاف فرمایا ہے کہ حضرت عمر نے طلاق السنۃ یعنی قرآن و حدیث کے مقرر کردہ طریق طلاق کو بدل کر طلاق بدعی کو رائج کر دیا۔" اور جو طلاق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بائن نہ تھی اس کو اپنے اختیار سے بائن قرار دیا۔ تقریر کے اس حصہ کو جب ہم پڑھ رہے تھے تو فوراً ہمارے دل میں یہ خیال آیا کہ اس کے بعد شاید یہ فقرہ آئے گا کہ جب حضرت عمر نے ایسا کیا تو مدینہ میں ہنگامہ برپا ہوا اور حضرت عمر قتل کر دیے گئے۔ کیونکہ وہ زمانہ ایسا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق کی آنکھیں دیکھے ہوئے لوگ ہزارہا کی تعداد میں موجود تھے، اور ان کی موجودگی میں کوئی شخص یہ جرأت نہ کر سکتا تھا کہ قرآن و حدیث کے احکام میں تغیر و تبدل کرے، اور خدا اور رسول کے احکام کی رو سے جو عورت اپنے شوہر سے جدا نہ ہوتی ہو اس کو اپنے حکم سے جدا کر دے!

لطف یہ ہے کہ اس کے بعد پروفیسر صاحب نے حضرت عمر کے اس فعل کی توجیہ جو فرمائی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے طلاق بدعی کو رائج نہیں کیا بلکہ لوگوں میں یہ بدعت رواج پا رہی تھی، اس لیے آپ نے اس کو روکنے کے لیے سزا کے طور پر فرمایا کہ جو شخص اپنی بیوی کو بیک وقت

تین طلاق دے گا اس کی بیوی اس سے جدا کر دی جائے گی۔ اس مسئلہ کو جس طریقہ سے ڈاکٹر صاحب نے بیان کیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے طلاق بدعی کی فقہی حیثیت اور اس کے بارے میں فقہاء کے اختلافات اور مختلف مذاہب کے استدلالات کا مطالعہ کیا ہی نہیں۔

طلاق کے مسئلہ میں سب سے زیادہ عجیب بات جو ڈاکٹر صاحب نے فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ آئندہ سے طلاق دینے کا حق شوہر سے چھین کر قاضی یا پنچایت کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ یہ تجویز دو حال سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یا تو ڈاکٹر صاحب نے قرآن مجید کی وہ آیات سرے سے پڑھی ہی نہیں جن میں طلاق دینے کا اختیار بلا شرکت غیرے صرف مرد کو دیا گیا ہے، یا اگر ان کو پڑھا ہے تو ڈاکٹر صاحب قاعدہ لا ینکر و التغیر الاحکام بتغیر الازمان کی رو سے اس بات کے قائل ہیں کہ تغیر زمانہ کے ساتھ قرآن مجید میں بھی ترمیم کی جا سکتی ہے! ہمیں نہیں معلوم کہ وہ ان دونوں شقوں میں سے کون سی شق اختیار کرنا پسند فرماتے ہیں۔ (باقی)

فضل فونٹ پن

سینیر ۸۶، جونیر ۱۱

نیا اسٹاک آچکا ہے

خوبصورت اور پائدار قیمت واجبی علاوہ اس کے سامان اسٹیشنری و کاغذ وغیرہ

خط و کتابت سے طلب فرمائیے

فدا علی محمد علی تاجر کاغذ پتھر گٹی حیدرآباد دکن